



## ستہری ڈھوپ میں برستی بارش

فاطمہ چوہدری

Downloaded From  
Paksociety.com

ہی سے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور یہ رونق رات گئے تک جاری رہی تھی۔ مہندی کی رسم بڑی دھوم، دھام سے منائی گئی تھی اور اب شاہ ہاؤس کے مکین اور تمام مہمان خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ماسوائے اس

آج شاہ ہاؤس اپنی پوری شان سے کھڑا روشنیوں اور رنگ برنگی قہقہوں سے جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔ آج بڑے شاہ جی سید و جاہت علی شاہ کے بڑے پوتے سید زمان علی شاہ کی رسم مہندی تھی۔ شاہ ہاؤس میں شام ڈھلے

ماہنامہ پاکیزہ 194 نومبر 2016ء





Downloaded From  
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



شاید یہ کسی کی نظروں کی تپش تھی جو رائیل کو پیچھے دیکھنا پڑا اور پیچھے نظر جاتے ہی ایک گروپ پر پہنچی جس کے بیچ کھڑا ایک بھرپور مردانہ وجاہت کا حامل لڑکا اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ رائیل کی نظروں کے تعاقب میں جب زارا نے بھی دیکھا تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ارے یہ تو یونیورسٹی کا سب سے بیسٹ گروپ ہے۔ اس کے تمام لڑکے، لڑکیاں یونیورسٹی کے ٹاپ اسٹوڈنٹس ہیں اور تو اور یہ لوگ تو کسی اور سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خاصے اونچے دماغ کے ہیں یہ سب۔“ زارا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ رائیل کو بتا دیا۔

”اور وہ جو سب سے ہینڈسم لڑکا ہے ناں جو بیچوں بیچ کھڑا ہے، وہ اس گروپ کا ہیڈ ہے۔ سید حمدان علی شاہ جو اپنی پرسیٹائیو اور قابلیت کے بل بوتے پر بہت اکڑتا ہے۔“ رائیل کافی حیران تھی کہ زارا کو یہ سب کیسے پتا ہے جبکہ آج تو اس کا بھی پہلا ہی دن تھا۔

”تم اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہو؟“

”لو..... ایکو ٹیلی میری ایک کزن بھی رادھری پڑھتی ہے بلکہ ان سب کی کلاس فیلو ہی ہے تو اس نے ہی مجھے بتایا تھا۔ اور ایڈمیشن کے دوران کئی دفعہ آنا ہوا تو ان کے بارے میں مجھے کافی معلومات ہیں۔“ اور پھر جتنی دیر زارا اور وہ وہاں بیٹھی رہیں، رائیل کو اس کی نظروں کی تپش محسوس ہوتی رہی۔ کلاس تو ہوئی نہیں تھی سودو نوں نے واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

گاڑی کے ہارن پر چوکیدار نے گیٹ واکیا جس پر سید حمدان علی شاہ گاڑی اندر لے آیا۔ پورچ میں گاڑی روکتے ہی اس کی نظر لان میں بیٹھی اماں جان اور اپنی ماما جان پر پڑی، ساتھ ہی اس کے ماموں کی بیٹی عرشہ بھی بیٹھی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لان کی طرف بڑھا۔

”السلام علیکم.....“

”وعلیکم السلام، جیتا رہ میرا شیر پتر۔“ اماں جان

کے جس کی آج پوری دنیا ہی تھیں نہیں تھی۔ رسم کے دوران جب اس نے اس شخص کو دیکھا جو اس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا تو اس کے اندر عجب بے کلی پھیل گئی تھی۔ وہ شخص وہ تھا جس نے اس سے اس کی عزت، غرور اور اس کی ذات کا مان چھین لیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج جی دامن تھی۔ ماضی قریب کی تمام تلخ یادیں آج نئے سرے سے یاد آ کر اسے کچھ کے لگا رہی تھیں۔ شاہ ہاؤس میں آنے کے فیصلے نے اسے پھر سے ماضی میں لا پٹا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے روز ہی وہ کلاس میں لیٹ پہنچی تھی۔ اسے اپنی کلاس ڈھونڈنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج طالب علموں کی کافی کم تعداد حاضر ہے۔ وہ کچھلی نشستوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی جب اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک لڑکی آ کر براجمان ہوئی۔ وہ خود تو کافی کم گو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی اس لیے دوسری لڑکی نے ہی بات چیت میں پہل کی۔

”ہیلو! آئی ایم زارا شہباز۔“

”اور میں رائیل شاہ۔“ اس نے بھی اپنا نام بتاتے ہوئے زارا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ ”لگتا ہے کہ آج کلاس نہیں ہوگی، فرسٹ ڈے عموماً کلاس نہیں ہوتی۔ چلو آؤ باہر چلتے ہیں اور ویسے بھی کلاس کا آدھا ٹائم تو گزر رہی چکا ہے۔“ زارا کے کہنے پر رائیل نے ایک نظر کلاس کو دیکھا جس میں اب ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا سو رائیل کو زارا کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں بیچ پر بیٹھ گئی تھیں۔

”تمہیں فزکس میں ماسٹرز کا خیال کیسے آیا؟“

”یہ میری ڈیئر ماما کا شوق تھا کہ میں فزکس کی فیلڈ جوائن کروں۔“ زارا کے پوچھنے پر رائیل نے جواب دیا۔

”اور مجھے بچپن سے ہی پیور سائنسز کو پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میرا یہ شوق آج مجھے یہاں بچا ہے یونیورسٹی بیچ لایا۔“ زارا نے اپنا بتایا۔



عرشہ کی ہاؤس جاب اور امان کے ایم بی اے کے بعد ہونا طے پائی تھی۔ اس رشتے سے حمدان آتے جاتے عرشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا۔

☆☆☆

ساہیوال کے بس اسٹاپ پر اترتے ہی رائیل نے ایک لمبی سانس لی اور فضا میں اپنے شہر کی خوشبو کو محسوس کیا۔

اسے اپنے شہر سے بہت پیار تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کبھی اپنے شہر سے دور نہ جاتی لیکن ”کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے“ پر عمل کرتے ہوئے اپنی پڑھائی کی خاطر اپنے شہر کو خیر باد کہنا پڑا۔ بی ایس سی تک ساہیوال میں تعلیم حاصل کر کے اب اسے ایم ایس سی کے لیے مجبوراً لاہور جانا پڑا۔ کیونکہ ساہیوال میں کوئی بڑا ادارہ ایم ایس سی نہیں کروا رہا تھا اور جو کروا رہا تھا وہاں فزکس کا مضمون نہیں تھا۔

رائیل نے بہت خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے شفیق سے پاپا جانی اسے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور بقول ان کے رائیل ان کی مینا ہے۔ یہی حال بہت سو برا اور پیاری سی ماما جانی کا تھا۔ رائیل کے پاپا جانی سید منہاج علی شاہ مقامی کالج میں میٹھس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے اور وہ اس شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہوں نے لندن سے میٹھس میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ جبکہ رائیل کی ماما جانی نے ان ہی کے سبکیٹ میں ایم فل کر رکھا تھا لیکن وہ ہاؤس وائف کا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ دونوں ماما، پاپا کی یہی اکلوتی اولاد تھی اور دونوں کے پیار نے اس کی ذات میں کوئی خرابی یا بگاڑ کے بجائے اس کی ذات میں مضبوطی اور نکھار پیدا کیا تھا۔ وہ اکلوتی ہونے کے باوجود اپنے والدین کی بہت فرمانبردار اولاد تھی۔ اس کی بڑی وجہ ان کے گھر کا ماحول تھا۔ پاپا جانی کا وقت، وقت پر دیا ہوا اخلاقیات پر لیکچر اور ماما جانی کی گھریلو تربیت نے اس کی شخصیت کو پُر اعتماد اور مکمل بنا دیا تھا۔

رائیل ساہیوال آئی تو سامان رکھ کر فوراً اپنی

کے لہجے میں اس کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔ ”اتنے دن لگا دیے آنے میں، جانتے بھی ہو کہ ماں تمہارے بغیر کتنی ادھوری ہے۔“ ماما جان نے اسے گلے لگاتے ہی شکوہ کیا۔

”کیا ماما جان! اب ایک سال ہی تو رہ گیا ہے پھر یہاں آپ کے قدموں میں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال لوں گا۔“

”باتیں کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔“ شافیہ بیگم نے اس کے فلسفیانہ انداز پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور عرشہ جی آپ کیسی ہیں؟ اور ہماری حویلی میں کب قدم رکھا؟“

”ارے، ہم تو کب سے آئے ہوئے ہیں، آپ کو اپنے کاموں سے فرصت ملے تو ادھر ادھر کی خبر ہو۔“ عرشہ کی اس سے گہری دوستی تھی جواب اس کے یونیورسٹی جانے سے ماند پڑ گئی تھی۔

”ہاں.....! یہ ڈائلاگ آپ اپنے ”ان“ کے لیے سنبھال رکھیے..... بس اگلے ماہ آنے ہی والے ہیں۔“ حمدان نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھیڑا۔ جس سے شرمیلی عرشہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

”چل ہٹ پرے..... بے شرم، کیوں تنگ کرنا ہے پپاری کو.....“ اماں جان نے اسے جھاڑا۔

”ہاں جی! پپاری تو بہت ہیں یہ محترمہ..... تبھی تو ہمارے بھیا کو لے اڑنے کے ارادے رکھتی ہیں۔“ حمدان نے یہ سرگوشی عرشہ کے کان میں کی ورنہ اماں جان سے کوئی بعید نہ تھی کہ اسے جوتی پہنچا رہی تھیں۔

عرشہ سے اس کی بچپن کی دوستی تھی۔ کھیل کود، دکھ، تکلیف سب میں وہ اس کی ساتھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ حمدان کے بڑے بھائی سید ایمان علی شاہ کو عرشہ اچھی لگنے لگی اور لگتی کیوں نہ..... وہ تھی ہی اتنی سادہ دل اور چھوٹی موٹی سی کہ کسی کا بھی دل اس پر آسکتا تھا لیکن حمدان نے ہمیشہ اسے چھوٹی بہن ہی سمجھا تھا۔ ایمان کی پسندیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے عرشہ کو ایمان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی جبکہ شادی



بیسٹ فرینڈ آمنہ کی طرف دوڑ لگا دی جو اُن کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں نے بی ایس سی تک اکٹھے پڑھا تھا اب آمنہ کی شادی اس کے کزن کے ساتھ طے ہو گئی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی میں دونوں کا ساتھ نہ ہو سکا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آمنہ نظر آ گئی تھی۔ جولان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہی تھی۔ ”کیسی ہو رائیل؟ تمہارے بغیر دیکھو کن، کن چیزوں میں خود کو الجھا لیا ہے میں نے۔“ گلے ملتے ہی آمنہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”بس، بس رہنے دو..... اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے تو پھر مجھ اکیلی کو جانے ہی کیوں دیا؟ لیکن تمہیں تو شادی کا شوق سوار تھا ناں..... اب سڑتی رہو.....“ رائیل کو ابھی تک آمنہ کے لاہور نہ جانے پر غصہ تھا سو آتے ہی اسے سنا ڈالیں۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو، اب اتنے دن بعد آئی ہو چلو سکون سے باتیں کریں..... اتنا کچھ ہے تمہیں بتانے کے لیے اور کچھ، کچھ تم سے سننے کے لیے۔“ آمنہ نے رائیل کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی سہیلی کی اس ادھر پر سکرادی۔

”ہاں تو اب سناؤ لاہور کا کوئی ڈریم مین ملا؟“ آمنہ نے رائیل کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں وہاں پڑھنے گئی ہوں..... ڈریم مین ڈھونڈنے نہیں۔“

”اچھا تو جناب ڈریم مین کے لیے آنکھیں کھول کر رکھنا پڑتی ہیں۔ وہ خود تمہارے پاس چل کر نہیں آئے گا۔“ آمنہ نے حسبِ عادت رائیل کو چھیڑا۔

”اچھا چھوڑو اپنے منگیتر کی سناؤ کب آرہا ہے تمہیں لینے۔“ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ اس طرح آمنہ سے ایک خوشگوار ملاقات کر کے وہ اپنے گھر آ گئی کیونکہ ابھی اسے اپنے پاپا جانی کو اپنے ہاتھ کی کافی بھی پلانی تھی۔

اب تو وہ سب یونیورسٹی سے مانوس ہو چکے تھے۔ چار ماہ کیسے گزرے پتا بھی نہیں چلا۔ آج رائیل اور زارا کا فرسٹ سمسٹر کالاسٹ پیپر تھا۔ دونوں آج بہت خوش تھیں کیونکہ دونوں کے پیپر ز بہت اچھے ہوئے تھے۔ رائیل اپنی کلاس کی سب سے ہونہار اسٹوڈنٹ تھی۔ پورا ڈیپارٹمنٹ یہ بات جانتا تھا۔ ایک تو وہ۔۔۔ بی ایس سی میں تھی بھی گولڈ میڈلسٹ اور اس یونیورسٹی آنے پر تو اس کے جوہر کھل کر سامنے آرہے تھے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔

وہ دونوں پیپر دے کر ہال سے باہر نکلیں تو موسم بہت حسین ہو رہا تھا۔ آسمان پر کالی بدلیاں اٹھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک تو پیپر ختم ہونے کی خوشی اور دوسرے موسم حسین، دونوں نے کینٹین جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کینٹین میں داخل ہوتیں وہی بیسٹ اور یونیورسٹی کا مشہور گروپ اُن کی طرف بڑھا اور ان میں سے حمدان علی شاہ نے انہیں سلام کیا۔

سید حمدان علی شاہ اپنی وجاہت کے علاوہ ذہانت میں بھی بے مثال تھا۔ رائیل کی طرح وہ بھی بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھا اور یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ اسے اچھے سے جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ اینول فنکشن میں اسے ہوسٹنگ کے لیے کہا جاتا لیکن اس سال اساتذہ نے رائیل شاہ کا نام بھی دیا۔ ایذا سے کوہو سٹ..... اسی کی بابت حمدان علی شاہ آج اس کے پاس چلا آیا تھا۔ حمدان علی شاہ کے سلام کا جواب صرف زارا نے دیا جبکہ رائیل نے ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”ایکسکوز می مس رائیل شاہ! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ حمدان نے رائیل کا رویہ نظر انداز کر کے اسے مخاطب کیا۔ جبکہ حمدان تو کسی ایرے غیرے کو بلانا پسند نہیں کرتا تھا مگر رائیل کو دوسری مرتبہ مخاطب کرنے پر حمدان کو ناگوار نہیں گزرا جبکہ گروپ کے باقی ممبرز حیران کھڑے تھے۔

”لیکن مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سنی۔“ رائیل

☆☆☆



نے حمدان میں ایسی کون سی فضولیات دیکھ لیں جن کی بنا پر تم اسے فضول کہہ رہی ہو؟“

”ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیوں اس کی طرف دار بنی ہوئی ہو، خیر میں تمہیں یہ پہلی اور آخری مرتبہ بتا رہی ہوں کہ مجھے اس شخص کی آنکھوں سے فرعونیت نکپتی ہوئی نظر آتی ہے، مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ غرور پتا نہیں کس بات کا ہے اس میں بڑا آیاؤ پرا کہیں کا۔“ رائیل نے بھی ایک ہی سانس میں حمدان علی شاہ کے گن گنوا دیے۔

”کیوں، اس نے تم پر ایسی کون سی نظر بازی کر لی ہے؟“ زارا اب بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ رائیل کے تمام الزامات مفروضات کی طرح خود ساختہ ہی تھے۔ جو کم از کم زارا کی سمجھ سے باہر تھے۔ اب زارا کو کون سمجھاتا کہ زندگی میں کچھ لوگوں سے بس اللہ واسطے کا بیر ہو جاتا ہے اور رائیل کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ رائیل کو اول روز سے ہی حمدان سے عجیب سی چڑ ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں اب کچھ نہیں سمجھا سکتی اور پلیز اب اس بندے کو گولی مارو اور چلو ورنہ بس نکل جائے گی۔“ زارا، رائیل کو یہ بات دوبارہ سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے ساتھ چل پڑی مبادا وہ مزید استفسار پر اسے ہی جھاڑ پلا دے۔

☆☆☆

ساہوال آ کر بھی رائیل کا موڈ آف ہی رہا تھا۔ اس فضول شخص کی وجہ سے آج زارا سے بھی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ یہ سوچ، سوچ کر رائیل کو زور بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ کب سے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کڑھ رہی تھی کہ کچن سے ماما جانی اس کے لیے جوس لے کر نکلیں۔

”ارے رائیل جانو، میں کب سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ الجھی، الجھی سی ہو، کیا پرابلم ہے میرا بچہ؟ آپ کو پتا ہے ماما جانی تو آپ کی فرینڈ ہیں، چلو جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟“ کچن ونگٹو سے وہ رائیل کو نوٹ کر رہی تھیں۔ سامنے ٹی وی لگا ہونے کے باوجود

ماہنامہ پاکیزہ 199 نومبر 2016ء

کے ری ایکشن پر وہاں موجود سبھی لوگ حیران کھڑے تھے۔ رائیل جیسی ویل مینرڈ لڑکی سے کوئی بھی اس طرح کی بدتمیزی کی امید نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ رائیل کو تو حمدان پہلے دن سے ہی عجیب لگا تھا کچھ زارا کی باتوں سے بھی رائیل کو حمدان کا غرور ایک آنکھ نہ بھایا۔

حمدان علی شاہ نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں لیکن کہا کچھ نہیں..... نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت وہ رائیل کو کچھ کہے بغیر چھوڑے جا رہا تھا۔ حمدان نے اپنے گروپ کو اشارہ کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ حمدان کے فرینڈز اس کے رد عمل پر حیران تھے تو دوسری جانب زارا، رائیل کے بی ہیوئیر پر حیران تھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ وہ یونیورسٹی کا سب سے ذہین اور ویل مینرڈ لڑکا ہے اور تم نے بغیر کسی سولڈ ریزن کے اسے سٹاڈ لیں۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا اس نے۔ ایک ضروری بات ہی تو کہنا تھی اسے تم سے۔“ ان کے جانے کے بعد زارا نے رائیل سے استفسار کیا اور اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی جبکہ رائیل اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال بھی چکی تھی۔

”تمہیں کچھ اور کہنا ہے یا اب چلیں؟“ زارا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ رائیل جیسی اچھی سلجھی ہوئی لڑکی تو وہ اب کہیں سے نہیں لگ رہی تھی۔ ”مجھے تم سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔ اس نے صرف بات کرنا تھی، تمہیں کھا نہیں جانا تھا۔“ زارا نے ایک بار پھر رائیل کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

”یار زارا، تمہیں پرابلم کیا ہے؟ ہاں..... میں جب اس شخص کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہ رہی تو پھر تم کیوں اسے بار، بار درمیان میں لارہی ہو۔ انتہائی فضول لوگوں کو کب سے ڈسکس کرنا شروع کر دیا ہے تم نے؟ چلو اب دیر ہو رہی ہے، ابھی سامان بھی اٹھانا ہے پھر بس ہی نہ نکل جائے۔“ ابھی رائیل نے دو قدم اٹھائے ہی تھے کہ زارا نے اس کی کلائی تھام لی۔

”ہم کہیں نہیں جا رہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم



نانا نانی، دادا، دادی ان کو عیدی دینے آتے تو وہ اسکول میں خوشی، خوشی اپنی چیزیں دکھا رہے ہوتے اور رائیل کی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اسکول سے واپسی پر پاپا جانی سے استفسار کرتی تھی اور پھر گھر آ کر ماما جانی سے بھی سوال کرنا نہیں بھولتی تھی..... لیکن جواب وہی ہوتا تھا۔

”بیٹا ابھی آپ چھوٹی ہو جب بڑی ہوگی تو سب سے ملوائیں گے آپ کو۔“ جیسے، جیسے رائیل شاہ بڑی ہوتی گئی اسے سمجھ آتی گئی کہ کوئی ایسا حادثہ یا کوئی ایسی بات ماضی میں ضرور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے یہ رشتے اس سے دور ہو گئے ہیں لیکن ایک نسلی بھی تھی کہ بڑے ہو کر یہ رشتے مل جائیں گے اور پھر وہ اپنے دادا، دادی اور نانا، نانی سے بہت سی عیدی لیا کرے گی اور اپنی فرینڈز کو دکھایا کرے گی لیکن اب جب وہ بالغ ہو گئی تھی تب بھی ماما جانی اور پاپا جانی اسے بتانے سے انکاری تھے۔ آج ماما جانی کا انکار سن کر اسے دلی دکھ ہوا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اگر یہ رشتے اچھے ہوتے تو ضرور میرے پاس بھی ہوتے شاید انہوں نے ماما جانی اور پاپا جانی کے ساتھ کچھ برا ہی کیا ہوگا جو آج دونوں ان رشتوں کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

ماما جانی اسے سوچوں میں گم چھوڑ کر کچن میں باغی دیکھنے کے لیے جا چکی تھیں۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آرام کی غرض سے چل دی۔

☆☆☆

”یار حمدان غصہ تھوک دے۔ وہ ایک لڑکی ہے، اس سے بدلہ لے کر تو کیا کرے گا اور پھر سب کو تمہاری عادات کا علم ہے، اس کے کہہ دینے سے تم برے تو نہیں بن سکتے ناں.....“ معزز پچھلے دو گھنٹوں سے اسے سمجھانے میں اپنا سر کھپا رہا تھا لیکن حمدان بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ اس کے سر پر رائیل شاہ سے بدلہ لینے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور اب اس کا اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنا ناممکن ہی لگتا تھا۔ اول تو وہ کسی کو بلا وجہ چھیڑتا نہیں تھا

وہ غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی بچپن سے عادت تھی کہ اگر کوئی بات بری لگتی تو وہ بات دنوں اس کے حواس پر سوار رہتی۔

”تو ماما جانی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، ایوری تھنک از اوکے.....“

”اوہ ماما کی جان.....“ ماما جانی نے اسے پیار سے گلے سے لگالیا۔

وہ ان کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تمام پیار سمیٹتی تھی۔ اسے دیکھ کر شازیہ بیگم کو اپنی ممانی جان یاد آ جاتی تھیں یعنی رائیل کی دادو..... وہ ہو بہو اپنی دادو پر پڑی تھی۔ ایک، ایک نقش رب نے بڑی خوب صورتی سے بنایا تھا۔ ویسی ہی بڑی، بڑی غزالی آنکھیں، سرو قد، کمر تک لمبے سلکی جھکتے بال اور ستواں ناک اور ساتھ، ساتھ سنہری رنگت اس کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بناتی تھی۔

رائیل نے ماما جانی کو اسے لگا تار دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھا۔

”کیا ماما جانی! آپ کبھی، کبھی مجھے ایسے کیوں دیکھنے لگتی ہیں، جیسے کچھ کھوج رہی ہوں..... میرے چہرے میں کسی اور کا چہرہ ڈھونڈ رہی ہوں؟“ وہ رائیل کے اس قدر پرفیکٹ اندازے پر چونکی ضرور تھیں لیکن لمحوں میں ہی سنبھل گئی تھیں۔

”آں ہاں.....! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میری بیٹی ہے ہی اتنی پیاری کہ اس کے ایک، ایک نقش کو دل میں اتارنے کو دل کرتا ہے۔“ ماما جانی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔

”آں ماما جانی! آپ نے اور پاپا جانی نے مجھے کبھی اپنے رشتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ آپ دونوں ہمیشہ بات ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ ابھی تو تم چھوٹی ہو لیکن اب تو میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہو گئی ہوں۔ پلیز اب تو بتا دیں۔“ رائیل کو ہمیشہ سے ہی رشتوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی فرینڈز کے کزنز آتے تھے۔ کھیلتے، گھومتے پھرتے تھے۔ پھر ان کے



اب جبکہ شروعات رائیل کی طرف سے ہوئی تھیں اور وہ بھی بلا کسی وجہ کے تو حمدان کا غصہ سوانیزے پر تھا۔

کچھ اس کی رگوں میں خاندانی خون دوڑ رہا تھا جو اپنا بدلہ لیے بنا ملتے نہیں تھے۔ بدلہ لینے پر آتے تو جان لیے بنا نہیں ملتے تھے لیکن اس وقت حمدان جان لینے سے پرے کچھ مختلف سوچ رہا تھا۔ رائیل نے بغیر کسی وجہ کے اس کی عزت اور وقار کو کرچی کرنے کی کوشش کی تھی۔ حمدان کو تو اساتذہ بھی بہت عزت دیتے تھے۔ ایک تو وہ تھامی ذہین اور فرمانبردار اور دوسرے وہ کسی کے لیے اذیت کا باعث نہیں بننا تھا۔ وہ جس بچ پر اب سوچ رہا تھا اس پر تو کسی کا دھیان جانی نہیں سکتا تھا۔

”تم اس انسلٹ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے جو بچ چورا ہے پر مجھے محسوس ہوئی ہے۔“ حمدان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہونے آرہا تھا۔

”یار تو سمجھنے کی کوشش تو کر..... یار کون پاگل لڑکیوں سے بدلہ لیتا ہے اور پھر یہ کہاں کی ٹھنڈی ہے کہ اس کی عزت بھی بچ چورا ہے پر بکھیرنا..... دیکھ وہ لڑکی ہے، اسے بہت فرق پڑے گا، تو، تو لڑکا ہے تجھے نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ تجھ پر کوئی انگلی اٹھانے والا ہے۔“

حمدان نے معیز کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو معیز کے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ وہ خود بہنوں والا تھا اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ رائیل کے ساتھ جو کچھ حمدان کرنے جا رہا ہے اس سے رائیل کی زندگی محدود اور مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

”تو اپنا لکچر بند کر اور بتا کہ تو میرا ساتھ دے رہا ہے یا نہیں۔“ حمدان کو معیز کا سمجھنا سخت زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

معیز کے تو پسینے چھوٹے ہوئے تھے کیونکہ اس نے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا۔ کیا تو حمدان نے بھی ایسا کچھ نہیں تھا، معیز، حمدان کو بچپن سے جانتا تھا، دونوں اکٹھے بورڈنگ میں پڑھتے تھے اور کلاس فیلوز ہونے کے ساتھ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ کالج میں بھی دونوں نے ایک سے بیکلش رکھے تھے پھر یونیورسٹی آ کر ان کی دوستی عزیز سے ہوئی وہ بھی انہی کی طرح پڑھا کو

سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اس طرح سے ان پانچ لڑکوں کا ایک گروپ بن گیا تھا جو یونیورسٹی میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ سب اپنے گروپ میں تو بہت شرارتیں کرتے تھے لیکن دوسروں کو بہت کم ہی شامل کرتے تھے۔ اس لیے سب ان کو تھوڑا مغرور سمجھتے تھے حالانکہ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ سب کی مدد بھی کھلے دل سے کرتے تھے۔ ان میں کبھی کسی نے کوئی غلط عادت نہیں دیکھی تھی۔

تجھی تو حمدان کی بات سن کر معیز کو دکھ ہوا تھا کیونکہ ان سب نے تو کبھی کچھ ایسا غلط سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات صرف حمدان اور معیز کے درمیان تھی۔ حمدان ہمیشہ اپنی ذاتی بات معیز سے شیئر کرتا تھا کیونکہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔

”تو غلط کر رہا ہے ایک بار پھر سوچ لے یار، ایسے جذبات میں آ کر بعد میں پچھتا نا نہ پڑے۔“ معیز نے ایک بار پھر حمدان کو سمجھانے کی کوشش کی جو رائیگاں ہی گئی۔

”تو میرا ساتھ دے رہا ہے کہ نہیں؟ بس مجھے اتنا بتا دے۔“ حمدان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رائیل جیسی ضدی چڑیا کے پرکاٹ ڈالے اور اسے بے بس کر دے۔

”او کے یار! کول ڈاؤن..... میں نے تجھے کبھی انکار کیا ہے۔“ معیز نے آخر کار ہتھیار ڈال ہی دیے۔ اگر وہ نہ بھی مانتا تو بھی حمدان نے کون سا اپنی سوچ کو عملی جامہ نہیں پہناتا تھا۔

”یہ ہوئی ناں بات! مجھے یقین تھا کہ تو انکار کر ہی نہیں سکتا۔“

”چل یار تجھے کچھ کھلاؤں پھر مجھے اپنے مشن پر کام بھی شروع کرنا ہے۔“ حمدان تو اس وقت کا سوچ

ماہنامہ پاکیزہ 201 نومبر 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



کر خوش ہو رہا تھا جب رائیل شاہ بے بس ہو کر اس کے سامنے گڑ گڑا رہی ہوئی۔ جبکہ معیز بڑی پرسوج لگا ہوں سے حمدان کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوست کو جس نے کبھی چیونٹی کا بھی دل نہیں دکھایا ہوگا اور اب بدلے کی آگ اسے کس حد تک لے آئی تھی۔

ٹھہرے پانی میں پتھر نہیں پھینکنے چاہئیں ورنہ جھینٹے تو آپ پر پڑیں گے ناں اور کبھی، کبھی خاموش جھیل میں کنگر پھینکنے سے آپ پر پڑنے والے جھینٹے آپ کے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ وجود کو بھی داغ دار کر جاتے ہیں اور ایسے داغ سیاہ داغوں کی طرح ان مٹ ہوتے ہیں جو آپ کے وجود پر اس طرح سے ثبت ہو جاتے ہیں کہ دوست احباب بھی آپ کو پہچاننے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ حمدان علی شاہ اور رائیل شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اول تو حمدان کسی کو تکلیف نہیں دیتا تھا لیکن اب تو رائیل شاہ نے خود اسے پکارا تھا..... بلکہ لکارا..... آئیل مجھے مار کی طرح..... اور یہ پکارنا رائیل شاہ کو بہت مہنگا پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

ساہیوال سے واپسی پر بھی سارا راستہ رائیل اپنے رشتے داروں کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی..... بس اسٹاپ سے یونیورسٹی ہاسٹل جاتے ہوئے بھی وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے اپنے قریب رکتی پراڈو کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہوش میں تو وہ تب آئی جب دو آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پراڈو میں سمجھنچ ڈالا۔ گاڑی میں بیٹھے ہی اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ ایک آدمی نے اس کے چہرے پر رومال رکھ دیا جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

”آف..... آ آ آ..... ماما جانی؟ پاپا جانی..... آ آ.....“ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی اس نے اپنے جان سے پیارے ماما اور پاپا کو پکارنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اسے اپنے پورے جسم میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا لیکن آنکھیں کھلنے کی دیر بھی اس نے جب خود کو غیر مانوس ماحول میں پایا تو سب کچھ اسے آہستہ آہستہ

ماہنامہ پاکیزہ 202 نومبر 2016ء

یاد آنے لگا تھا کہ کس طرح وہ یہاں پہنچی تھی۔

”یعنی کہ میں اغوا ہو چکی ہوں..... آف..... لیکن یہ سب کون کرے گا؟ میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا..... ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا ہے۔“ رائیل شاہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اغوا ہو چکی ہے۔

”اور میرے ماما جانی اور پاپا جانی..... وہ..... وہ کیسے یہ خبر سن پائیں گے..... لڑکی کے لیے تو یہ داغ بن جاتا ہے کہ وہ اغوا ہوئی ہے پھر میرے ماما اور پاپا جانی کیسے برداشت کریں گے؟ اے میرے اللہ یہ کیا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ سوچوں کا ایک لاقتنا ہی سلسلہ تھا جو رائیل کو رونے اور چیخنے چلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ سب سوچ، سوچ کر رائیل کو لگ رہا تھا کہ اس کے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔

ایک دم ہی اسے کچھ خیال آیا جس کے تحت اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ بہت ہی نفیس اور خوب صورت بیڈ پر موجود تھی۔ حد سے زیادہ خوب صورت اور اسٹائلش پردے اور ان سے ہم رنگ قالین اور کمرے میں موجود ڈیکوریشن پیمز بہت اعلیٰ ذوق کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ رائیل نے بھاگ کر کھڑکی دیکھنے کی کوشش لیکن یہ کیا کھڑکی پر تو بہت مضبوط جنگلا لگا ہوا تھا۔ باہر بہت اندھیرا تھا اور شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”میں دوپہر دو بجے بس سے اتری تھی اور اب رات کا پہر ہے..... یعنی مجھے آدھا دن گزر گیا یہاں آئے ہوئے..... آف میرے خدایا۔“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”سب میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“ رائیل کو اس سوچ کے ساتھ، ساتھ ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور اسے رات کی بارش سے بہت خوف آتا تھا۔ بادل کی گرج اور چمک سے اس کا دل دہل جاتا تھا۔ جب بھی رات کو ایسی بارشیں اور گرج چمک ہوتی تو ماما جانی اس کے کمرے میں آ کر اسے اپنی نرم، نرم آغوش میں چھپا لیتی تھیں لیکن اب وہ تنہا تھی۔ رائیل کو یہ سوچ کر اور بھی



کوشش کی۔

”اس سب کو اس کا کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
اس کی باتوں سے مطلب اخذ کر کے رائیل کے توپکے  
چھوٹ گئے تھے۔

”وہ ہی جو مطلب تمہیں سمجھ آیا ہے۔ اچھا پہلے یہ  
کھانا کھالو پھر تمہیں اپنے سب مطلب سمجھا دیتا  
ہوں۔“ حمدان نے کھانے سے بھری ٹرے اس کے  
سامنے رکھ دی جسے رائیل نے بڑے زور سے زمین پر  
دے مارا تھا۔

”تزاخ.....“ حمدان کا ہاتھ بے ساختہ ہی اٹھا تھا  
اور رائیل کا چہرہ سرخ کر گیا تھا..... ہاتھ اتنا بھاری پڑا  
تھا کہ رائیل کا سر سائڈ ٹیبل کے کنارے لگا تھا اور وہ  
درو سے بلبلانٹھی تھی جبکہ اس کا چہرہ لمحوں میں خون سے  
تر ہو گیا تھا۔

حمدان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا  
اور رائیل، حمدان کی بانہوں میں ہی جھول گئی تھی۔

☆☆☆

رائیل کی آنکھ کھلی تو اس نے کراہ کر پانی کی  
ضرورت محسوس کی۔ جس پر قریب کرسی پر بیٹھے حمدان  
نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی  
اٹھایا اور رائیل کے آگے کیا۔ اس نے گلاس پکڑنے  
کی کوشش کی لیکن سر کا درد اتنا شدید تھا کہ وہ اٹھنے سے  
قاصر تھی جس پر حمدان نے اسے کمر سے پکڑ کر سہارا دیا  
اور پانی کے چند گھونٹ اسے پلائے۔

اگر رائیل اس حال میں نہ ہوتی تو کبھی وہ یہ سب  
برداشت نہیں کرتی لیکن ایک تو سر میں شدید درد اوپر  
سے اس ظالم کی قید..... رائیل کو اپنی بے بسی پر جی بھر  
کے رونا آیا۔

حمدان دیکھ رہا تھا کہ گزشتہ دو دن سے رائیل کی  
حالت کیسی دگرگوں ہو گئی تھی۔ گلابی، گلابی گال اب  
بخار میں ہونے کے باوجود پیلے، پیلے سے ہو گئے تھے۔  
حمدان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

”رائیل شاہ.....! رونا بند کرو اور یہ کھانا کھا  
ماہنامہ پاکیزہ 203 نومبر 2016ء

شدت سے رونا آ رہا تھا اب اس کی حالت بہت خراب  
ہو رہی تھی۔ کمرے میں پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی اور  
وہ صبح سے بھوکی پیاسی تھی۔ اس پر پھر سے غنودگی طاری  
ہو رہی تھی۔ شاید اس رومال والے نشے کا اثر تھا کہ وہ  
دوبارہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے دروازہ کھلنے کی  
آواز آئی تو اس نے اپنی آنکھیں بھر پور کوشش سے  
پوری کھولیں۔ کھڑکی سے آتی روشنی اسے صبح کا سلام  
پیش کر رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی دروازے پر  
پڑنے والی رائیل کی نظر پلٹنا بھول گئی تھی۔ دروازے  
پر تو سید حمدان علی شاہ اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑا تھا  
اور رائیل کی ہونق بنی شکل دیکھ کر مسکرا رہا تھا لیکن رائیل  
کو تو اس کی ہنسی مکروہ لگ رہی تھی۔

”تنت..... تم! تم..... کیسے یہ سب.....  
کیوں.....؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ روتے، روتے  
رائیل کو وہ سب ایک دم یاد آ گیا تھا۔ ہاں وہ یونورشی  
کادن..... اُف تو اس نے اس دن کا بدلہ لینے کے لیے  
یہ گھٹیا حرکت کی۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....؟ ہاں؟ اگر تم  
اس دن کی بات کو لے کر یہ سب کر رہے ہو تو دیکھو میں  
تم سے معافی مانگ لیتی ہوں..... مجھے جانے دو  
پلیز..... تم نہیں جانتے لڑکی کی عزت کیا ہوتی  
ہے..... پلیز.....“ اور کوئی موقع ہوتا تو رائیل، حمدان کو  
دو چار تھپڑ رسید کرتی لیکن اب تو وہ اس کی قید میں تھی  
اور اسے اس قید سے جلد از جلد چھٹکارا پانا تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ اب تم یہاں سے جب تک  
میں نہ چاہوں کہیں بھی نہیں جاسکتیں اور ہاں اگر تم نے  
یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ  
دوں گا..... دوسری بات عزت..... ہا..... ہا تو مس  
رائیل شاہ عزت کا تو آپ کو خود نہیں پتا کہ کیا ہوتی ہے  
اور ویسے بھی اب تو تمہیں سب لوگ میری عزت کی نگاہ  
سے دیکھیں گے۔ سو..... اپنی عزت کی تو تم فکر مت  
کرو..... وہ میری امانت.....“ حمدان نے بڑے  
تکمانہ انداز سے رائیل کو سب کچھ یاد کروانے کی



لو.....“ جب سے رائیل یہاں آئی تھی تب سے اس نے صرف ایک گلاس پانی ہی پیا تھا۔ یعنی اس نے مسلسل دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

”نہیں، میں یہ نہیں کھا سکتی..... پلیز تمہیں رب کا واسطہ..... مجھے جانے دو۔“

”دیکھو اگر تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گی تو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔“

”اوکے، تم وعدہ کرو کہ میرے کھانا کھالینے کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

”وعدہ نہیں کرتا ہاں کوشش ضرور کروں گا۔“

ابھی تو حمدان نے اپنا پلان پورا کرنا تھا وہ کیسے جانے دے سکتا تھا رائیل کو.....

”تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟“ رائیل نے روتے ہوئے حمدان سے استفسار کیا تھا۔

”پہلے تم کھانا ختم کرو..... پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا وعدہ.....“ حمدان نے بھی سوچا کہ چلو جلد ہی کام پورا ہو جائے گا اور پھر اسی بہانے پر لڑکی کچھ کھا ہی لے گی۔

رائیل یہ سن کر کھانا کھانے لگی لیکن اس سے نوالے حلق سے نیچے اتارے نہیں جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے گلے میں کانٹے آگ آئے ہوں لیکن پھر بھی اس نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر ہی لیا تھا کچھ تو وہ بھوک بھی تھی اور کچھ اسے کچھ وجوہات جاننے کی بھی جلدی تھی۔

”پلیز اب بتا دو یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ رائیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی غلطی پتا چلے جس کی سزا میں اسے یہاں لایا گیا تھا۔

”ہاں تو اب تم میری بات تحمل سے سننا..... تمہیں اپنی عزت کا بہت خیال ہے ناں تو اب تم میری عزت بن جاؤ..... تمہاری عزت کی ذمہ داری بھی میرے ذمے آ جائے گی..... اور ہاں جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے ورنہ تم جانتی ہو کہ یہ کام کیسے پتا میں تمہیں

مابنامہ پاکیزہ ﴿ 204 ﴾ نومبر 2016ء

یہاں سے جانے ہی نہیں دوں گا۔“ حمدان کا ڈھکا چھپا مطالبہ سن کر رائیل تو بے ہوش ہوتے، ہوتے پئی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حمدان ایسا کچھ کرے گا کیونکہ اگر رائیل کو حمدان سے کوئی چڑ بھی تو وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے اپنے دماغ کا فتور ہے اور اتنا تو وہ علم رکھتی تھی کہ حمدان یونیورسٹی کا اچھا اسٹوڈنٹ تھا۔ حمدان کے مطالبے نے اسے بہت سے پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتی تو حمدان اسے جانے نہیں دیتا اور پھر ایسی صورت میں اس کے ماما، پاپا کیسے جی پاتے جن کی اکلوتی پونجی ہی وہ تھی۔ ان سب پہلوؤں کو دیکھتے سوچتے ہوئے اس نے حمدان کو ہاں کر دی تھی اور اس کے علاوہ کوئی آپشن بھی تو نہیں تھا۔

لیکن حمدان کو رائیل کی ہاں کھلی تھی..... وہ کیسے اتنی جلدی مان گئی یہ حمدان کی سمجھ سے باہر تھا۔ خیر اس نے یہ سب سوچیں فوراً سے جھٹک ڈالیں کیونکہ اس کا مقصد تو رائیل کو بے بس کرنا تھا اور اپنے منہ پر عزت کی قید کرنا تھا۔ جس طرح رائیل نے اسے بے عزت کیا تھا اسی طرح اب وہ بھی رائیل کو تا عمر بے بس ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر خوشیوں کے دروازے بند کر دینا چاہتا تھا۔ یہ سب حمدان شاہ کے مزاج کے بالکل برعکس تھا لیکن بدلے کی آگ کب کسی کو کچھ سوچنے کے قابل چھوڑتی ہے۔

گلے چند گھنٹوں میں رائیل کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ رائیل منہاج شاہ سے رائیل حمدان علی شاہ بن گئی تھی۔ سائن کرتے ہوئے اسے اپنی بے بسی اور اکیلے پن پر بہت رونا آیا۔ ایسا کیا تھا جو رائیل یہ سب کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یہ خود رائیل بھی نہیں جان پاتی تھی۔

”پلیز اب تو مجھے جانے دو.....“ حمدان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر رائیل نے پھر سے اس کی منت کی۔

جوں، جوں حمدان بیڈ کے قریب آ رہا تھا ویسے ویسے رائیل کا دل دھڑک رہا تھا۔



”تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟“ کار اشارت کرتے ہی حمدان نے رائیل سے پوچھا جو کسی گڑیا کی طرح خاموش بغیر پلکیں جھپکائے بیٹھی تھی۔

”اوہیلو..... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں.....“ حمدان نے رائیل کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا تو وہ دنیا میں واپس لوٹی تھی۔

”کہیں بھی اتار دو..... اب زندگی میں کوئی بھی راستہ مجھے سرخرو نہیں کر پائے گا۔“

”اور میں ایسا چاہتا بھی نہیں ہوں۔“ حمدان نے بڑی بے رحمی سے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ حمدان نے یونیورسٹی سے تھوڑا پہلے ہی کار روک دی تھی مگر رائیل کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

”چلو اترو بھی اب.....“ حمدان نے رائیل کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

رائیل بتا اس کی طرف دیکھے کار سے نیچے اتر گئی تھی۔

”اور یہ اپنا بیگ بھی لیتی جاؤ۔“ حمدان نے اسے اس کا بیگ دینے کے لیے پیچھے سے ہانک لگائی۔

رائیل نے پلٹتے ہی بیگ گاڑی کی سیٹ سے اٹھا لیا تھا۔

رائیل کے پلٹنے پر حمدان کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی اور پلٹتا بھول گئی تھی، کچھ تو تھا جو رائیل کے

چہرے کو حمدان کے لیے خاص بنا گیا تھا۔ بس ایک لمحہ تھا

وہ..... حمدان کے دل میں کچھ، کچھ ہوا تھا رائیل کے

پیلے، پیلے نقوش کو دیکھ کر..... سرخ ہوتی ناک کو دیکھ

کر..... ادھ اوڑھے ذوٹے میں رائیل کے بکھرے

بالوں کو دیکھ کر..... کیا حال ہو گیا تھا رائیل کا صرف اس

کی وجہ سے..... حمدان ابھی ملال کی وادی میں قدم رکھنا

ہی چاہتا تھا کہ خود ساختہ اٹانے راستہ روک لیا۔

”نہیں..... یہ سب تو ہونا ہی تھا..... ہر چیز کا

بدلہ تو لازم ہے۔“ حمدان نے تمام خیالات کو جھٹکتے

ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

☆☆☆

ہاسٹل وارڈن نے رائیل کو آڑے ہاتھوں لیا تھا

اور یونیورسٹی سے نکال دیے جانے کے سنگین نتائج سے

مہینہ پانچواں 205 نومبر 2016ء

”دیکھو میں نے تمہارا کہا مان لیا ہے لیکن اس سے آگے کچھ نہیں مان سکتی پلیز مجھ سے دور رہو.....“

”ہا..... مسز رائیل حمدان شاہ کو کتنی خوش فہمی ہے

اپنے بارے میں..... تم میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ

تمہارے قریب آیا جائے بلکہ مجھے تو تمہارا وجود ہی

برداشت نہیں تو تمہیں چھوٹا تو دور کی بات ہے۔“

حمدان بول نہیں رہا تھا بلکہ پھنکار رہا تھا۔

”تو پھر تمہیں مجھے اس بندھن میں باندھنے کی کیا

ضرورت تھی؟“

”صرف اور صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے

بے بس دیکھنے کے لیے اور شاید دنیا کے سامنے....

بے عزت کرنے کے لیے..... تمہیں بہت اچھا لگتا ہے ناں

کہ لوگ تمہیں نیک و پارسا جانیں تو دیکھ لو اب لوگ کیا

کہیں گے۔“ وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ رائیل کا اندر تک

جل اٹھا تھا۔

”اب کرو مجھ سے بدتمیزی..... منہ توڑ دوں گا

میں تمہارا.....“ حمدان نے رائیل کا چہرہ اپنے ہاتھ سے

اتنی زور سے دبایا کہ رائیل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”چلو آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں اور ہاں..... یہ

بات ذہن نشین کر لو کہ آئندہ کسی بھی لڑکے سے بدتمیزی

مت کرنا ورنہ نتیجہ تم دیکھ ہی چکی ہو۔“ رائیل کو تو کچھ

سنائی ہی نہیں دے رہا تھا اسے اب حمدان کی باتوں سے

کوئی سروکار نہیں رہا تھا کیونکہ زندگی تو وہ اس کی برباد

کر ہی چکا تھا۔ اسے زارا کی، یونیورسٹی کی، لوگوں کی

کوئی فکر نہیں تھی..... اسے بس اپنے ماما، پاپا کی فکر

ستار ہی تھی کہ وہ کس حال میں ہوں گے..... وہ اس

سے کیسا سلوک کریں گے۔ لیکن اسے ایک یقین بھی تھا

کہ ماما، پاپا اس کی بات سنیں گے..... انہیں رائیل پر

یقین ہوگا کیونکہ زندگی میں کبھی کوئی کام ان کی مرضی

کے خلاف نہیں کیا تھا اور پھر وہ کردار کے لحاظ سے کوئی

گری ہوئی لڑکی نہیں تھی۔ اسے اپنے پاپا، ماما پر پورا

یقین تھا کہ وہ اسے سنبھال لیں گے۔

☆☆☆



اور یونیورسٹی میں تم نہیں تھیں پھر تمہارا انتظار کیا گیا لیکن انکل، آنٹی کی ڈیڈ باڈیز اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں زیادہ دیر رکھا جاتا۔ سو ہمیں انہیں ان کی آخری آرام گاہ پہنچانا پڑا..... بہت افسوس ہوا..... لیکن تم.....“ آمنہ، رائیل کی طرف نظریں کیے بغیر ہی اسے روح فرسا خبر سنارہی تھی لیکن جیسے ہی آمنہ کی نظر رائیل کے پھیکے چہرے پر پڑی تو زبان تالو سے لگ گئی اور اگلے ہی لمحے رائیل پورے قد سے زمین پر آگری تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ زندگی بہت پھلکی لگنے لگی تھی۔ زندگی کے سب رنگ عجیب لگنے لگے تھے۔ رائیل..... رنگوں سے پیار کرنے والی لڑکی..... رنگوں سے بھاگنے لگی تھی۔ رائیل کو جب کچھ سمجھ آنے لگا، تب تک سب لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ صرف آمنہ اور اس کے امی، ابو رہ گئے تھے۔ آگے زندگی اکیلے کیسے کٹی تھی..... یہ سوچ رائیل کو بستر سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ جان سے پیارے والدین کی وفات پر کون، کون آیا تھا..... تدفین کیسے کی گئی۔

سوائے چند جانے والوں کے اور کوئی رشتے دار نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی پروفیسر صاحب کے خاندان کو نہیں جانتا تھا۔ صرف پروفیسر صاحب کے کولیکڑ، اسٹوڈنٹس اور چند ایک آس پڑوس کے لوگ ہی تدفین میں شامل ہوئے تھے۔ یہ سب آمنہ ہی کی بدولت رائیل کو پتا چلا تھا۔

آمنہ نے رائیل سے بہت پوچھا کہ وہ کہاں تھی یا اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو بھی بتا دے وہ اور اس کے والدین اس کا پرابلم حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن رائیل کے منہ پر پڑے قفل نہیں ٹوٹے..... پھر آمنہ نے بھی استفسار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر اینڈ مسز منہاج علی شاہ کو دنیا سے گئے بیس دن سے اوپر ہو گئے تھے۔ رائیل کو تو دنیا کی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی رہتی۔ آمنہ ہی تھی جو اس کا کسی بچے کی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ وہ دن رات

بھی آگاہ کر دیتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی تو پھر.....؟ اب رائیل کے پاس گھر جانے کے علاوہ کوئی چار نہیں تھا۔ زارا سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن وارڈن نے اس سے بھی نہیں ملنے دیا۔ یہ کہہ کر کہ ”تم باقی گریز کو بھی خراب کرو گی، نہ جانے کہاں رہیں گے گھر والے بھی پتا کرتے رہے۔“ وہ اپنے ماما، پاپا کے خیال سے کانپ گئی تو کیا ان کو بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ ہاسٹل میں نہیں تھی۔

لاہور سے ساہیوال تک کا سفر آج سے پہلے کبھی اتنا طویل نہیں لگا تھا لیکن اب تو یہ سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رائیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے اور اس بات کا یقین کر لے کہ اس کے ماما، پاپا کو اپنی بیٹی پر بھروسا ہے اور وہ اسے لوگوں کی طرح بے عزت نہیں کریں گے مگر.....!

چار دن غائب رہنے کے بعد وہ آج اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی مگر اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ گیٹ کھلا تھا..... چونکدار موجود نہیں تھا۔ لان میں سفید چادر پھیٹی تھی جس پر جا بجا کھجور کی گٹھلیاں پڑی تھیں اور بہت سے مرد حضرات گٹھلیوں پر کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

اس کے قدم یہ سب دیکھ کر ڈم گئے تھے لیکن وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اندر لاؤنج تک آئی۔ وہاں خواتین بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں پھر اچانک سامنے سے آئی ہوئی آمنہ دکھائی دی۔

”رائیل کہاں تھیں تم.....؟“ آمنہ نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ سب کیا ہے؟ ماما جانی اور پاپا جانی کہاں ہیں؟“ رائیل کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے پاپا جانی اور ماما جانی کو نہیں دیکھا تھا۔ آمنہ نے اسے کندھوں سے تھاما۔

”رائیل حوصلے سے سنو انکل، آنٹی کا تو تین روز پہلے ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا، ہم نے تمہیں کا میٹلٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تمہارا سیل فون آف تھا



رائیل کی بہت فکر تھی..... جوان بچی تھی..... منہاج صاحب نے بہت کچھ چھوڑا تھا رائیل کے لیے..... لیکن ایک لڑکی کی زندگی صرف پیسے پر تو نہیں بسر ہوتی، اسے ایک مضبوط سائبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس دنیا کے بھیڑیے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔

لیٹے، لیٹے رائیل کو اچانک حمدان کا خیال آیا تھا۔ ”ہاں وہی ہے اس سب کا ذمے دار..... میری بربادی کا اور ماما جانی، پاپا جانی کی موت کا ذمے دار، نہ وہ میرے ساتھ ایسا کرتا، نہ ماما جانی اور پاپا جانی کو میرے اغوا کی خبر ملتی اور نہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوتا۔“ سوچ تو رائیل ٹھیک رہی تھی لیکن مسٹر اینڈ مسز منہاج کا تو رب کی طرف سے لکھا ہی یوں ہوا تھا اور لکھے ہوئے کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر موت کا تو ایک بہانا بننا ہوتا ہے۔ موت تو برحق ہے، یہ سوچتے ہوئے رائیل کو حمدان سے بہت نفرت محسوس ہوئی تھی اور خود سے اس سے بھی زیادہ نفرت اس کا غدی تعلق کی بنا پر جو حمدان اس سے زبردستی قائم کر چکا تھا۔ اس لمحے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

کیا جانتی تھی وہ حمدان علی شاہ کے بارے میں؟ کچھ بھی تو نہیں سوائے اس کے کہ وہ یونیورسٹی کا ہونہار اور اساتذہ کا ہر دل عزیز اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کہاں کا رہنے والا تھا، اس کا خاندان کیسا تھا؟ اس کا کاشیکٹ نمبر؟ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس..... یعنی وہ تہی دامان رہ گئی تھی۔ زندگی کی بازی، خوشیوں اور امیدوں کی بازی ہار گئی تھی وہ.....!

”سید حمدان علی شاہ.....! تم سے زیادہ نفرت میں اس دنیا میں کسی سے نہیں کرتی..... سنا تم نے..... کسی سے نہیں..... کسی سے بھی نہیں۔“ رائیل ہذیبانی انداز میں چپٹی تھی کہ اس کی کپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

☆☆☆

”چاچی.....! میری بار بی ڈول کہاں ہے؟“ دانی نے ہانپتے ہوئے اپنی چاچی سے چھوٹی بہن کا پوچھا جو خود کسی کام میں مصروف تھیں..... وہ خود بھی

ماہنامہ پاکیزہ 207 نومبر 2016ء

اس کے ساتھ تھی۔ گھر میں ایک گاڑی، اس کی آیا اماں جو کچن سنبھالتی تھیں اور گھر کی صفائی کی ذمے داری بھی انہی کی تھی اور ان کے شوہر شرفو بابا جو باہر سے ضرورت کا سامان لا دیتے تھے یا لان کو دیکھتے تھے۔ یہ فیملی شروع سے ہی سروٹ کو ارٹھر میں رہائش پزیر تھی اور گھر کے افراد ہی کی طرح تھے۔ رائیل کو ماما جانی سے زیادہ شریقاں اماں نے پالا تھا۔ اب بھی شریقاں اماں، رائیل کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھیں۔

”رائیل..... میری دھی! ایسا کب تک چلے گا؟ کمرے سے تم باہر نہیں نکلتیں، کپڑے تم نے سفید اور کالے پہننے شروع کر دیے ہیں، میری دھی! زندگی اسی کا نام ہے، ایک نہ ایک دن ہم سب کو اس رب سوہنے کے پاس جانا ہے..... کوئی پہلے تو کوئی بعد میں جائے گا۔ میری دھی سنبھال خود کو..... ابھی تو تیرا پورا جیون پڑا ہے۔“ اماں شریقاں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی رائیل کو سینے میں بھینچ کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کی سسکیاں نکل گئیں۔ آج اس کے آنسو کھل کر بر سے تھے۔ آخری بار، وہ حمدان کے آگے گڑ گڑائی تھی اور دوبارہ اب رو رہی تھی۔

”نہ میری دھی.....! روتے نہیں..... جانے والوں کی روح کو دکھ ہوگا۔ ان کی روحیں بے قرار ہوں گی۔“

”اماں کیوں چلے گئے ماما جانی اور پاپا جانی..... انہیں پتا بھی تھا کہ ان کی رائیل کا ان کے علاوہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں.....“ رائیل نے اماں شریقاں کا جھریوں بھرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔ اماں کیا جواب دیتی..... وہ جانتی تھی کہ رائیل اکیلی نہیں ہے، رشتے دار موجود ہیں لیکن ان کا کسی کو علم نہیں کہ وہ سب کہاں ہیں۔ رائیل کی ماما جانی اکثر ان سے اپنے رشتے داروں کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن کبھی انہیں ان کے شہر کا نہیں بتایا۔

اماں شریقاں بہت نیک خاتون تھیں تو شرفو بابا بھی عاجزی و انکساری میں کچھ کم نہیں تھے..... دونوں کو



بیٹیاں ہی تو ماں کے دکھ، سکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔

جبکہ گڑیا کی ماما بھی یہ بات سن کر خوش تھیں.....  
انہیں بھی بھابی کے تینوں بیٹے اور خاص طور پر دانی بہت  
پسند تھا اور وہ تھا بھی ان کی لاڈلی کا دیوانہ.....

☆☆☆

سید حسنین علی شاہ کی ایک ہی اولاد تھی۔ سید  
وجاہت علی شاہ..... وجاہت علی شاہ کی پیدائش پر چند  
بچیدگیاں ہونے کے باعث سید حسنین کی شریک  
حیات اس جہان سے کوچ کر گئی تھیں۔ پھر انہوں نے  
بہنوں کے بے حد اصرار پر اور کچھ وجاہت شاہ کا سوچ  
کر دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیگم بہت ہی نیک دل  
خاتون تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے پتا نہیں کس مصلحت کے  
تحت انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ انہوں نے  
وجاہت شاہ کو ہی اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر متا کا پیار دیا  
پھر انہوں نے وجاہت شاہ کے لیے اپنی بھانجی ذکیہ کو  
منتخب کیا جس پر وجاہت شاہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔  
ذکیہ بیگم بھی اپنی خالہ کا پر تو تھیں..... نہایت صابر و شاکر  
اور عاجز تھیں۔ وجاہت شاہ کی زندگی کی گاڑی ذکیہ  
بیگم کے ہمراہ نہایت سبک روی سے چل رہی تھی۔  
وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ سید حسنین شاہ اور ان کی  
بیگم وجاہت شاہ کو داغ مفارقت دے گئے۔

سید وجاہت علی شاہ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں سے  
نوازا تھا۔ سید منان علی شاہ اور سید منہاج علی  
شاہ..... دونوں میں مثالی پیار تھا۔ منان شاہ نے بی  
اے کر کے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور باپ کی زمینوں  
اور فیکٹریوں کو سنبھالنے لگے۔

اماں جان یعنی بیگم وجاہت علی شاہ نے منان شاہ  
کی شادی ان کی پسند سے اپنی بیٹی سے کر دی جو نہایت  
ہی خوش اخلاق تھی۔ انہوں نے آتے ہی تمام کام اپنے  
ذمے لے لیے تھے اور اپنی پچھٹی کو بستر پر بٹھا دیا تھا۔ ان  
کی اپنے دیور منہاج سے بہت ہنسی تھی۔ منہاج شاہ ان  
دونوں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ان کا ارادہ  
بی ایچ ڈی کرنے کا تھا جبکہ وجاہت شاہ چاہتے تھے کہ

شاید کھیل کر آ رہا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے  
پارک تک گیا تھا ورنہ تو اسے صرف باری ڈول ہی اپنا  
سب کچھ لگتی تھی۔ اور بچوں کے ساتھ وہ زیادہ فری نہیں  
ہوتا تھا۔ اسے زندگی کے رنگ ڈول کے ہونے سے ہی  
نظر آتے تھے۔

”دادو کے روم میں دیکھو دانی.....“ چاچی نے  
اس کے چہرے پر اپنی گڑیا کے لیے فکر دیکھی اور وہ  
مسکرا دیں۔

دانی اپنی باری ڈول سے تین سال بڑا تھا.....  
ڈول اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ پھولے، پھولے گلابی  
گال اور سفید کھلتا ہوا رنگ، سنہرے بال..... ایسے ہی تو  
وہ اسے ڈول نہیں کہتا تھا۔ دانی کو ہر وقت ڈول کی ہی  
فکر ستاتی رہتی۔ اسکول جاتے وقت سب سے پہلے وہ  
اس کے گال پر چناچٹ پیار کرتا تھا۔ واپس آتے ہی  
اسے ڈھونڈتا..... اس کے لیے راستے سے خریدی  
کینڈیز اسے خود کھلاتا۔

جب ماما جان سونے کا کہتیں تو وہ ڈول کو ساتھ لیے  
اپنے بیڈ روم میں چلا جاتا اور اسے اس کے کاٹ میں خود  
سلاتا تھا۔ بڑے پیار سے اس کے بال سنوارتا اور  
باقاعدہ ماں کی زبان سے سنی لوری سناتا۔ گالوں پر بو سے  
دے کر سلاتا..... گھر والے اس کی ان حرکتوں پر ہنستے تھے  
اور اس قدر پیار پر بڑا پریشان بھی ہو جاتے تھے۔

”یہ لڑکا تو رانو کے پیچھے باؤلا ہو گیا ہے، میں تو  
کہتی ہوں ان دونوں کو ایک ہی کر دیں گے..... ورنہ  
یہ لڑکا تو اس کا ساتھ چھوٹنے پر ایک، ایک کو مار ڈالے  
گا۔“ اماں جان ہنس کر کہتیں تو ان کی دونوں بہویں بھی  
ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیتیں۔

”اماں جان مجھے تو کوئی اعتراض نہیں..... مجھے تو  
گڑیا اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر پیاری ہے۔“ شافیہ بیگم  
کی آنکھیں نم ہو گئیں..... دراصل تین بیٹوں کے بعد  
ڈاکٹر نے انہیں مزید بچوں کے لیے روک دیا تھا ان کی  
حالت کے پیش نظر ورنہ انہیں بیٹی کا بہت شوق تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ 208 نومبر 2016ء



درمیان ہی بیٹھوں گا ناں.....  
 ”ٹھیک ہے اگر تم نہیں مانتے تو چلے جاؤ لیکن  
 اپنی بیوی اور بچی کو یہاں ہی چھوڑ دو اور دوبارہ یہاں  
 قدم مت رکھنا۔“ بابا کا حکم سن کر تو ان کے قدموں تلے  
 سے زمین نکل گئی لیکن شاید سید و جاہت شاہ یہ بات  
 بھول گئے تھے کہ ان کی یہ اولاد بھی ان ہی کی طرح  
 ضدی ہے جبکہ دروازے کی اوٹ سے باتیں سنتی بیگم  
 منہاج اپنے ماموں کا یہ حکم سن کر ہٹکا بٹکا رہ گئیں۔ وہ  
 اپنے شوہر کو جانتی تھیں..... وہ پی ایچ ڈی کیے بغیر  
 نہیں ٹلیں گے اور وہ خود اپنے محبوب شوہر کے بغیر کیسے  
 رہیں گی؟ ایک طرف اتنے پیارے رشتے تو دوسری  
 طرف محبوب شوہر..... خیر..... ہونا تو وہی تھا جو منہاج  
 شاہ کہتے۔

منہاج شاہ نے جب اپنے بابا جان کو کسی صورت  
 مانتے نہ دیکھا تو پھر ایک فیصلہ کر کے وہاں سے اٹھ کر  
 اپنے کمرے میں آ گئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے  
 کہ انہیں اپنے کاندھے پر ایک نرم ہاتھ محسوس  
 ہوا..... دیکھا تو شریک حیات تھیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ سب بہتر کرے گا۔“  
 ”لیکن میں بابا جان کو جانتا ہوں..... وہ اب  
 کبھی نہیں مانیں گے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو..... جو  
 میں کہوں گا اس میں میرا ساتھ دو گی؟“ نہ جانے کیا  
 سوچ کر انہوں نے اپنی بیگم سے ایسا کہا لیکن وہ تو تھیں  
 ہی ان کی دیوانی..... سو جھٹ سے انہیں ہاں کہہ دی۔  
 ”تھینک یو سوچ..... مجھے تم سے یہی امید  
 تھی..... چلو اب جلدی سے اپنی اور ڈول کی پیکنگ  
 کر لو..... ہمیں اگلے دو گھنٹوں میں یہ سب کچھ چھوڑ کر  
 جانا ہے۔“ منہاج شاہ کا حکم تھا یا روح فرسا خبر..... وہ  
 تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں ایسا..... ستم یہ کہ وہ ان سے  
 وعدہ کر چکی تھیں۔

آنکھوں میں آنسو لیے وہ اس امید پر پیکنگ  
 کرنے لگیں کہ اماں جان یا بڑی بھابی روک لیں گی  
 لیکن وقت روانگی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اماں جان اور

وہ بھی منان شاہ کی طرح کاروبار سنبھالیں۔ وقت  
 آگے گزرا تو شافیہ بیگم نے اماں جان کے کہنے پر منہاج  
 سے اس کی پسند دریافت کی جس پر انہوں نے اپنی دور  
 پرے کی رشتے کی پھپھو کی بیٹی کا نام لے دیا۔ جس پر گھر  
 والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس کو منہاج کے  
 لیے بیاہ لائے۔ مسز منہاج بھی بہت اچھی تھیں۔  
 دونوں بہوؤں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ منہاج  
 شاہ نے شادی کے بعد اپنا ایم فل مکمل کیا اور اب وہ پی  
 ایچ ڈی کا سوچ رہے تھے۔ انہیں تعلیم سے بہت لگاؤ تھا  
 اور وہ ایک اعلیٰ استاد بننا چاہتے تھے..... کاروبار  
 سنبھال کر اپنی ڈگریوں کو زنگ آلود نہیں کرنا چاہتے  
 تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس آنگن میں خنسی  
 قلقاریاں گونجنے لگی تھیں۔

سید منان علی شاہ کے ہاں یکے بعد دیگرے تین  
 بیٹے ہوئے..... زمان علی شاہ، امان علی شاہ اور سب  
 سے چھوٹا، لاڈلہ شاہ..... یعنی سب کا دانی.....

لیکن منہاج شاہ کو قدرت نے صرف ایک بیٹی  
 سے نوازا تھا جو سب سے بڑھ کر دانی کی گڑیا تھی۔

منہاج شاہ نے اپنے بابا سے پی ایچ ڈی کرنے  
 کی اجازت طلب کی تو وہ بھڑک اٹھے۔

”تمہیں آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں..... اتنا  
 بڑا کاروبار ہے اور تمہیں پڑھ کر نوکری کرنے کا شوق ہے؟  
 تم تو شاہوں کی اولاد لگتے ہی نہیں۔“

”لیکن بابا پلیز یہ لاسٹ ڈگری ہے، بس تین  
 سال لگیں گے اور پھر میں آپ کے پاس ہمیشہ، ہمیشہ  
 کے لیے آ جاؤں گا۔“ منہاج شاہ اپنے بابا کو تسلی دے  
 رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ و جاہت شاہ کے  
 دماغ کی سوچی جہاں انک جائے وہاں سے آگے  
 نہیں ہلتی۔

”تم اپنی بچی کو سنبھالو..... ماں ہے تمہاری جو تم سے  
 پیار کرتی ہے۔ بھائی، بھابی ہیں تمہارے..... تمہیں کسی کا  
 خیال نہیں.....“

”بابا تو میں تین سال بعد آ کر بھی سب کے



کے ساتھ کا دو بار سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ اماں ایم بی اے کر چکا تھا اور ہائیر اسٹیڈیز کے لیے ملک سے باہر گیا تھا۔ جبکہ دانی بزنس فیلڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا گیا تھا۔ اسے بھی اپنے چاچو کی طرح پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

سید منہاج شاہ کے گھر سے چلے جانے کے چار سال بعد وجاہت شاہ کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ منہاج شاہ سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ وہ تعلقات کی راہوں کی سب راہیں مسدود کر گئے تھے۔

زندگیاں سنبھل گئی تھیں لیکن سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں ایک ہوک اٹھتی تھی..... اماں جان کو اپنا لاڈلا منہاج، خوابوں میں آکر سنا تا تو بھابی کو اپنا لائق اور نٹ کھٹ دیور بہت یاد آتا تھا۔ زمان اور اماں کو بہن کی کمی محسوس ہوتی تھی تو دانی کو اپنی باریبی ڈول بہت یاد آتی تھی..... دادو اکثر ذکر چھیڑ دیتے کہ ڈول کو تو اپنے دانی کی دلہن بنانا تھا لیکن اب نہ جانے ڈول کہاں کھو گئی تھی..... منان شاہ نے بھی باپ کے بعد بھائی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کو نہ ملنا تھا اور نہ ملے۔

ہاں دانی کو انتظار تھا اپنی ڈول کا..... گلابی گالوں والی گڑیا کا.....

”دیکھیے گا دادو..... میری باریبی ڈول ضرور آئے گی ایک دن..... اسے ہماری چاہت واپس لائے گی۔ ہاں میری چاہت اسے لائے گی..... چاہت کی شدت.....“ وہ اکثر دادو کی گود میں سر رکھے پیار سے ڈول کو یاد کرتا تھا لیکن آخری جملہ اپنے دل میں ہی کہتا تھا۔ اس کی سوچوں کے گرداب میں اس کی ڈول تھی اور اب جوان ہو کر بھی سوچوں کا محور وہی ڈول تھی۔

ہاں اسے شدید محبت تھی اپنی باریبی ڈول سے..... اور یہ محبت وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ

بھابی کے روتے ہوئے چہرے بھی منہاج شاہ کو روک نہیں پائے اور پھر اماں جان اور بھابی کو انہیں روکنے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ سید وجاہت علی شاہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا ورنہ بصورت دیگر وہ بھی ان کے ساتھ ہی اس گھر سے جاسکتی تھیں۔

منہاج شاہ، اماں جان اور بھابی سے مل کر گھر کی دہلیز پار کرنے ہی والے تھے کہ وجاہت شاہ کی گرج دار آواز نے ان کے قدم روک دیے۔

”اب اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں..... گھر کی دہلیز پار کر جاؤ گے تو کبھی یہاں کا رخ مت کرنا۔“  
”اور سنو لڑکی..... تمہیں اپنے ماں، باپ کے گھر دیکھا تو وہاں سے بھی نکلنا دوں گا۔ تم دونوں کا اب شاہ خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔“

منہاج شاہ کو تو بابا جان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنا جنون پانے کے لیے یہ سب برداشت تو کرنا پڑے گا اور اگر اس کٹھن سفر میں اپنی جان سے عزیز بیوی کا ساتھ رہا تو سفر سہل ہو جائے گا لیکن وہ تو شاک میں آگئی تھیں..... یعنی اب ماں باپ سے بھی نہیں مل سکتیں..... جو ایک موہوم سی امید باقی تھی وہ بھی ختم..... لیکن اپنے شوہر اور بچی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

اور پھر منہاج شاہ اپنی بیوی اور بچی سمیت اس عالی شان حویلی سے چلے گئے تھے بھی نہ لوٹنے کے لیے۔ اسکول سے گھر آتے ہی بچوں نے چاچا، چاچی اور دانی نے تو صرف ڈول کا پوچھا..... پھر جو خبر انہیں دی گئی وہ بچوں کے ننھے ذہنوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ زمان اور اماں تو نارمل زندگی گزار رہے تھے لیکن دانی نے اپنے جان سے پیارے چاچو اور ڈول کا دکھ سینے سے لگا لیا تھا۔ پورا ایک مہینہ بخار میں پھنک رہا..... رات کو ڈول کے بغیر روتے، روتے سوتا تھا۔

وقت گزرنے کا علم ہی نہیں ہوسکا..... بچے جوان ہو گئے.....!

زمان نے ایم بی اے کر کے اپنے والد منان شاہ

ماہنامہ پاکیزہ 210 نومبر 2016ء